محمد مظہر الدین صدیقی

مقام انسانیت

(۲)

(سلسلہ کے لئے دیکھیئے ثقافت جنوری ۱۹۵۶ء)

کہا جاتا ہے کہ اسلام نے خدا کی عظمت اور ماورائیت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے انسان کی حیثیت بہت پست ہو گئی ہے اور وہ صرف مشیت الٰہی کا ایک بے بس آلۂ کار بن کر رہ گیا ہے لیکن معترضین یہ بھول جاتے ہیں کہ عیسائیت کے برعکس جس نے انسان کو پیدائشی گنہ گار قرار دیا اور اس کی نجات کا دارو مدار مسیح کی شفاعت پر رکھا۔ اسلام نے انسان کا جو تصور پیش کیا اس کی رو سے وہ اصلاً نیک سرشت، اصلاح پسند اور تعمیری ذوق سے بہرہ ور ہے۔ اگر الوہیت مسیح کے معنے یہ لئے جائیں کہ انسان میں خدا سے ہمکنار ہونے کی صلاحیت موجود ہے تو اس مفہوم سے عیسائیت کے عقیدۂ نجات کی تردید ہوتی ہے کہ انسان فطرتاً برائی اور فساد کی جانب مائل ہے اور مسیح کے توسط کے بغیر مستحق نجات نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے سرے سے شفاعت اور توسط کو رد کر دیا اور انسان کو براہِ راست خدا سے متوسل کرا دیا اس طرح اس نے انسان کی حیثیت کو پست کرنے کے بجائے اس کو مرتبہ ہستی میں اور زیادہ بلند کر دیا۔ کیونکہ اب انسان کو کسی نجات دہندہ شفاعتی کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ خدا کے سامنے اپنے افعال و اعمال کا راست ذمہ دار قرار پایا۔ غالباً قرآن میں آدم کی تخلیق کے سلسلہ میں فرشتوں کا جو اعتراض مذکور ہے کہ یہ خون بہائے گا، اور فساد پیدا کرے گا۔ قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء) اس کا اشارہ اسی عیسائی عقیدۂ کی طرف ہے کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے بدی شر اور ظلم کی جانب مائل ہے۔ لیکن قرآن یہ کہہ کر فرشتوں کو خاموش کر دیتا ہے کہ اِنّی اعلم ما لا تعلمون (میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے) سوال یہ ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کا کیا مطلب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کا اندازہ غلط ہے۔ بے شک انسان فساد بھی کرے گا خون بھی بہائے گا ظلم اور بدی کا بھی ارتکاب کرے گا۔ تخریب اور انتشار آفرینی کا بھی مرتکب ہوگا مگر یہ معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے اور وہ بھی کمزور پہلو۔ اس کے مقابلہ میں انسان فساد سے زیادہ اصلاح تخریب سے زیادہ تعمیر ظلم سے زیادہ عدل اور شر سے زیادہ خیر کرے گا۔ اس طرح قرآن نے فرشتوں کی قنوطیت کے بجائے انسان کے بارے میں اعتماد اور رجائیت کا اظہار کیا اور ان مذاہب سابقہ کی تردید کر دی جن کا نقطۂ نظر انسان کے متعلق مایوسانہ تھا اور جو یہ سمجھتے تھے کہ جب تک خدا خود مجسم ہو کر

انسان کی صورت نہ اختیار کرے اور اس کے لئے وسیلہ شفاعت نہ بن جائے۔ اس وقت تک انسان اپنی ذاتی جد و جہد اور سعی کوشش سے نجات نہیں پاسکتا۔ مختصر یہ کہ اسلام نے انسانی سعی و عمل کی حقیقت اور انسان کی فاعلانہ اور تاثیری قوت کا اثبات کیا۔ پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی سعی و عمل بے حقیقت ہے یا انسان قدرتِ الٰہی کا محض آلۂ کار ہے۔

قرآن نے انسان کے متعلق صرف رجائیت کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اس حقیقت کا بھی اعلان کیا کہ فطرتِ انسانی اصلاً خیر اور فطرتِ الٰہی سے ہمکنار ہے فاقم وجھک للدین حنیفاً فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ (اور تم اپنا رخ دین حنیفی کی طرف کرو۔ اللہ کی فطرت وہ ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اور خدا کی بناوٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہے) جہاں انجیل اور دوسری مذہبی کتب نے انسان کو صرف ذاتِ الٰہی کا عکس و پرتو قرار دیا تھا قرآن نے انسان کی فطرت کو بالاصل الٰہی فطرت قرار دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر انسان جزوی طور پر صفاتِ الٰہی سے متصف ہے اور سرشتِ انسانی میں صفاتِ الٰہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ پھر اگر یہ صحیح ہے کہ عالم انسانی فطرتِ الٰہی کی جلوہ گاہ ہے تو یہ دعوےٰ کس طرح کیا جاسکتا ہے کہ انسان کا ارادہ غیر حقیقی اس کی آزادی بے اصل اور اس کا اختیار لایعنی ہے۔ کیونکہ اس نقطۂ نظر سے خود خدا کے ارادہ اور اختیار پر حرف آتا ہے۔ اگر خدا کی صفات مثلاً ارادہ اور فعل بے حقیقت نہیں تو انسان کی مماثل صفات کا بے اصل ہونا بالکل قرین عقل نہیں۔ قرآن نے انسان کو ذلیل و پست کرنے کے بجائے تکریم آدم کا زور شور سے اعلان کیا ہے۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملنٰھم فی البر والبحر ورزقنٰھم من الطیبٰت وفضلنٰھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً

ہم نے بنی آدم کو عزت دی اور سمندر اور خشکی میں اس کو چلایا اسے عمدہ چیزوں کا رزق دیا اور اپنی مخلوق میں سے اکثر پر اسے فضیلت دی

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم — ہم نے انسان کو بہترین فطرت پر پیدا کیا

قرآن ہی تھا جس نے سب سے پہلے انسان کو تسخیر کائنات کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ جن مظاہر فطرت سے تم خوف کھا کر ان کی پرستش کرتے ہو وہ تمہارے تابع فرمان اور زیر نگین ہو سکتے ہیں۔

یدعون من دون اللہ ما لا یضرہ وما لا ینفعہ — یہ لوگ خدا کے سوا ایسی ہستیوں کی عبادت کرتے ہیں جن سے نہ ان کو نفع پہنچ سکتا ہے اور نہ نقصان۔

اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض و انزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرٰت — خدا وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس میں سے پھل پیدا کئے جس سے تمہارے

رزقاً لکم و سخر لکم الفلک لتجری فی البحر
بامرہٖ و سخر لکم الانہار و سخر لکم الشمس
و القمر دائبین و سخر لکم اللیل و النہار
و اٰتاکم من کل ما سألتموہ (۱۴ - ۳۲)

لئے رزق اور تمہارے لئے کشتیاں یعنی جہازوں کی تسخیر کی
تاکہ وہ اس کے حکم سے سمندروں میں چلیں پھر تمہارے لئے
نہروں اور دریاؤں کی تسخیر کی پھر تمہارے لئے سورج اور چاند کی
تسخیر کی جو اپنے راستوں پر چلتے رہتے ہیں اور تمہارے لئے
دن اور رات کی تسخیر کی اور تمہیں ہر چیز عطا کی جس کا تم نے سوال کیا

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوٰت
و ما فی الارض و اسبغ علیکم نعمہ
ظاہرۃً و باطنۃً
(۲۱ - ۲۰)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس
کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور تم
پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتوں کی تکمیل کی ہے۔

و ھو الذی سخر البحر لتاکلوا منہ لحماً
طریاً و تستخرجوا منہ حلیۃً تلبسونہا
و تری الفلک مواخر فیہ و لتبتغوا
من فضلہ و لعلکم تشکرون
(۱۲ - ۱۴)

وہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندروں کی تسخیر کی تاکہ
اس میں سے تم تازہ تازہ گوشت کھاؤ اور اپنی پوشش کے
لئے زیور نکالو اور تم دیکھتے ہو کہ اس میں کشتیاں اور جہاز
چلتے ہیں تاکہ تم اس کے فضل کو تلاش کرو۔ اور شاید اس طرح
تم اس کے شکر گزار ہو۔

یہ تو ہوا انسان کا مقام کائنات خارجی کے بالمقابل۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن انسان کو خارجی عوامل کے مقابلہ میں بے بس نہیں قرار دیتا بلکہ اسے تسلیم ہے کہ انسان حوادث فطری اور تغیرات خارجی پر اپنے عمل کے ذریعہ موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ ایک آزاد اور فعال ہستی ہے جو اپنے ارادوں کے مطابق عالم خارجی کی تشکیل و ترمیم کر سکتا ہے۔ البتہ یہ ترمیم و تبدیلی بھی انہیں قوانین کے تحت عمل میں آ سکتی ہے۔ جن کا خالق خدا ہے۔ اس لئے خدا کی فعالیت اور انسان کی فعالیت میں کوئی لازمی تصادم اور تضاد نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اسلام معاشرتی اور سیاسی نظامات کی تعمیر و تشکیل میں انسان کو ایک موثر اور فاعل ہستی قرار دیتا ہے۔ کیا اسے یہ بھی تسلیم ہے کہ انسان اپنے نفس اور باطن کی اصلاح و تغیر پر قادر ہے یا محض قدرت کا بے جان آلۂ کار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مقام بہت نازک ہے۔ اگر اس دائرہ میں ہم انسان کو فاعل و خود مختار ہستی تسلیم کرتے ہیں تو اس سے خدا کی مطلقیت محدود ہو جاتی ہے۔ اور دوسری طرف اگر ہم خدا کو نفسی اور نظاماتی تغیرات کا تنہا عامل قرار دیں تو انسان ہر قسم کی اخلاقی ذمہ داری اور جزا و سزا سے سبکدوش ہو جاتا ہے اور کائنات میں جو کچھ تخریب فساد ظلم اور شر واقع ہو رہا ہے اس کا وقوع بھی ہمیں خالق کی جانب منسوب کرنا پڑتا ہے۔ لیکن قرآن

کا جواب اس معاملہ میں اتنا مبہم نہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی نظریہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اخلاقی جد و جہد میں انسان کو خدا کا تعاون درکار رہتا ہے اور وہ نصرتِ الٰہی کے بغیر اس راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بغیر انسانی سعی و کوشش اور حرکت پذیری کے خدا آپ سے آپ انسان کو مدد دیتا رہتا ہے۔ یا وہ نیکی کی راہ میں آگے بڑھنے پر آمادہ نہ بھی ہو تب بھی خدا اس کو لازماً نیکی اور سعادت پر جبراً و قہراً لے جائے قرآن کہتا ہے کہ انتخاب اور آغاز کا معاملہ انسان کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ اگر انسان ایک بار اپنی آزاد مرضی اور ارادہ سے راہِ حق کا انتخاب کر لے اور اس کی طرف سے سعی و عمل کی ابتدا بھی ہو جائے تو خدا یقیناً اس کی معاونت کرے گا ورنہ انسان کے انتخاب اور ابتدا کئے بغیر خدا کی طرف سے از خود کوئی تحریک نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ قرآن نہایت صاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے۔

ذالک بانّ اللہ لم یک مغیرًا نعمۃ
انعمہا علی قوم حتیٰ یغیروا ما
بانفسہم (۸ - ۵۳)

یہ اس لئے کہ اللہ اپنی کسی نعمت جو اس نے کسی قوم پر نازل
کی اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ قوم اُسے خود
نہ بدل ڈالے۔

انّ اللہ لا یغیر بالقوم حتیٰ یغیرو
ما بانفسہم (۱۲-۱۱)

اللہ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک
کہ وہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے۔

ان دونوں آیات میں انسان کو اصل فاعل اور خدا کو اس کا مددگار قرار دیا ہے اور صاف کہہ دیا گیا ہے کہ انسان کے نفسی نظاماتی اور ادارہ جاتی تغیرات کی تحریک خود اسی کی طرف سے ہونی چاہیئے تب خدا اپنی فاعلانہ قوت کو کام میں لائے گا۔ مذکورہ بالا آیات سے یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن خدا اور انسان دونوں کو فاعلانہ اور تاثیری قوت کا حامل خیال کرتا ہے اور یہ تصور بالکل غلط ہے کہ اسلام کا خدا اتنا ماورائی اور مطلق ہے کہ اس نے انسانی اختیار کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ دونوں آیات بتاتی ہیں کہ نفسی اور ادارہ جاتی انقلابات و تغیرات میں خدا اور انسان دونوں فاعلانہ حیثیت سے شریک ہیں اور خدا خود اپنی طرف سے کسی تغیر کی ابتدا نہیں کرتا ۔ قرآن ایک جگہ نہیں بلکہ متعدد مقامات پر اس حقیقت کا اعادہ کرتا ہے کہ انسان کے تمام معاشرتی اور سیاسی مصائب خواہ جنگ و جدل اور خونریزی کی صورت میں ہوں یا معاشی بدحالی اور اقتصادی پستی کی شکل اختیار کریں یا سیاسی غلامی اور اخلاقی نکبت کے روپ میں ظاہر ہوں، انسان کے اپنے افعال و اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ان کی ذمہ داری خدا کے سر نہیں ڈالی جا سکتی۔

ظہر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت
ایدی الناس لیذیقہم بعض الذی
عملوا لعلہم یرجعون (۳۰ - ۴۱)

خشکی اور تری میں فساد رونما ہو گیا ہے ان اعمال کی
وجہ سے جن کے انسان مرتکب ہو لے ہیں تاکہ اللہ ان کے
افعال و اعمال کا ان کو مزہ چکھا دے۔ شاید کہ وہ خدا کی طرف

رجوع کریں۔

ولولا ان تصیبھم مصیبۃ بما قدمت
ایدیھم فیقولو ربنا ارسلت الینا
رسولا فنتبع آیتک ونکون من المؤمنین
(۲۸-۴۷)

اور اگر قریش پر ان کے اعمال کی وجہ سے مصیبت آتی تو
وہ کہنے لگتے کہ اے خدا تو نے ہمارے لئے کوئی رسول کیوں نہ
بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور ایمان والے بن
جاتے۔

واذا اذقنا الناس رحمۃ فرحوا بھا
وان تصبھم سیئۃ بما قدمت
ایدیھم اذا ھم یقنطون
(۳۰-۳۶)

اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ
غرور سے پھول جاتا ہے اور جب اس پر کوئی مصیبت اپنے
کی وجہ سے آتی ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے۔

ان تینوں آیات میں انسانی مصائب کو افعال بشری کا لازمی نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور تینوں مقامات پر انسان کی اجتماعی زندگی کا ذکر ہے نہ کہ اس کی شخصی اور انفرادی زندگی کا جس سے معلوم ہوا کہ اجتماعی زندگی کے آفات و مصائب کا خالق خود انسان ہے نہ کہ خدا۔ حالانکہ آخری آیت میں جہاں رحمت کا ذکر ہے خدا نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ انسانی سعادت اور فوز و فلاح تو خدا کی نصرت کے بغیر ممکن نہیں لیکن قوموں پر جنگ۔ فساد۔ اندرونی بدامنی، سیاسی بے چینی، معاشی بدحالی۔ اقتصادی پستی اور تمدنی جمود کی شکل میں جو مصائب آتے ہیں وہ بالکلیہ ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن انسان کو ایک فاعل اور موثر ہستی قرار دیتا ہے اور وحدت الوجودی صوفیا کا یہ عقیدہ غیر قرآنی ہے کہ خدا کے سوا عالم میں اور کوئی موثر ہستی نہیں۔ قرآن میں کئی جگہ احسن الخالقین اور احکم الحاکمین جیسے الفاظ آئے ہیں۔ ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان خلق اور حکم پر قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی قدرت اور حکومت محدود اور تابع فرمان الٰہی ہے۔ اس کے برعکس خدا سب حاکموں اور خالقوں پر مافوق ہے۔ اسکی مشیت جن قوانین کی صورت میں اجتماعی میں رونما ہوتی ہے ان سے سرتابی کرنا انسان کے لئے ممکن ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن کے نقطۂ نظر سے انسانی آزادی و اختیار ایک حقیقت نفس الامری ہے لیکن یہ اختیار محدود و مشروط اور سنن الٰہی یعنی قوانین قدرت کی پابندی سے مقصود ہے۔

یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انسان اپنی آزادی اور اختیار کے غلط استعمال سے جو شر اور مصائب پیدا کرتا ہے ان کا فاعل اور خالق بھی خدا ہی کو ماننا پڑے گا۔ کیونکہ یہ آزادی اور اختیار بھی بہرحال عطیہ الٰہی ہے۔ اس لئے شر کا خالق بھی ہے اور خیر کا بھی۔ شر اور خیر پیدا کرنے میں انسان کا اپنا کوئی دخل نہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ انسان کلاً یا جزواً اپنے افعال و کردار کا خالق ہے۔ اعمال خیر و شر ازل سے متعین ہو چکے ہیں اور انسان سے جدا صادر ہوتے ہیں، وہ ایک پہلے سے بنے بنائے نقشہ کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جو کچھ ازل سے مقدر ہو

وہ ہو کر رہے گا۔ انسان صرف تقدیر الٰہی کا ایک کھلونا اور ایک بےجان مشین کا پرزہ ہے جو بغیر کسی شعور اور ارادہ کے مشیت الٰہی کو پورا کرتا رہتا ہے۔ یہی وہ مفہوم تقدیر ہے جس سے مسلمانوں کا جذبۂ عمل ماؤف ہو گیا ہے اور وہ اپنی سیاسی ابتری معاشی بدحالی کا اور تمدنی پستی کا الزام خدا کے سر رکھ کر اپنی ذمہ داریوں سے بچنا چاہتے ہیں اور ایک عارضی سکون کے بدلے دُنیا کی مادی فلاح اور آخرت کی روحانی مسرتوں سے محروم رہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ انسانی اختیار و آزادی انسان کی انتخابی صلاحیت اس کی قوت ادراک اور صلاحیت تعقل یہ تمام صفات مشیت الٰہی کی پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے بالواسطہ خدا ان تمام اعمال خیر و شر کا خالق ہے جو ان کے باعث معرض وجود میں آتے ہیں۔ لیکن اس سے انسانی ذمہ داری کا انکار لازم آتا اور نہ ہم اس بناء پر اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں کہ ہمارے اختیاری افعال بھی خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ کیونکہ ہم کسی فعل کو اختیاری نہیں کہہ سکتے جس کا سر رشتہ ہمارے اپنے ہاتھ میں نہ ہو اور جو ہمارے شعور اور ارادہ کے بغیر کسی دوسری ہستی کے ارادہ اور حکم سے سرزد ہو۔ اگر انسان کی حیثیت بالکل ایک مشین کے پرزہ کی قرار دی جائے جس کو کوئی دوسری قوت ہلاتی اور حرکت دیتی ہو اور جس میں اس کے اپنے ارادہ کا دخل نہیں تو پھر انسانی اختیار و آزادی کا تصور بالکل بے معنی ہو جاتا ہے اور خدا کا پیدا کردہ اور عطا کردہ اختیار بے کار ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا نے کوئی چیز بے حقیقت نہیں پیدا کی اور نہ وہ انسان کو دھوکا دینا چاہتا تھا کہ ظاہر میں اس کو اختیار عطا کرے اور فی الواقع اس اختیار کی کوئی اصلیت نہ ہو۔ قرآن نے کفار و مشرکین کو اسی نظریہ کی بنا پر مردود قرار دیا کہ وہ انسان کے اختیار و آزادی اور اس کی قوت انتخاب کا انکار کرتے تھے اور اپنی ضلالت اور فسق و فجور کا الزام بھی خدا کے سر رکھنا چاہتے تھے۔

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا آباؤنا ولا حرمنا من شیئ کذالک کذب الذین من قبلھم حتیٰ ذاقوا باسنا۔ قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا ان تتبعون الا الظن وان انتم الا تخرصون۔ قل فللہ الحجۃ البالغۃ فلو شاء لھداکم اجمعین

(۶ - ۱۴۸)

جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا شرک نہ کرتے اور نہ ہم پر کوئی شے حرام ہوتی۔ اسی طرح ان کے پہلے کے لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا یہاں تک کہ انہیں ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا۔ کہو تمہارے پاس کوئی علم ہے جس کو تم ہمارے سامنے لاؤ۔ تم تو صرف گمان و قیاس کی پیروی کرتے ہو اور اٹکل پچو کام کرنے کے عادی ہو۔ کہو اللہ کے پاس سب سے بہتر حجت ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا۔

وقال الذین اشرکوا لو شاء اللہ ماعبدنا من دونہ من شیئ نحن

اور جن لوگوں نے شرک کیا وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے۔ نہ ہم اور نہ

ولا آباؤنا ولا حرمنا من دونه من شيء كذالك فعل الذين من قبلهم فهل على الرسول الا البلاغ المبين (۱۶-۳۵)

ہمارے آباؤ اجداد اور ہم پر کوئی شے حرام ہوتی - ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی یہی کیا - پھر رسول پر اس کے سوا اور کیا فرض ہے کہ وہ صاف صاف انہیں ہمارا پیغام پہنچا دے -

قرآن نے کفار اور مشرکین کے برخلاف یہاں انسانی ارادہ اور اختیار کا اثبات کیا ہے اور اس خیال کی تردید کی ہے کہ انسانی ضلالت فسق و فجور اور انسان کے اجتماعی آفات و مصائب براہ راست خدا کے حکم سے وجود میں آتے ہیں کفار کی اس دلیل کے مقابلہ میں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرتے - اور نہ ہی ظلم و ضلالت میں مبتلا ہوتے۔ قرآن نے ایک بہت معنی خیز بات کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کو ایک بے اختیار ہستی بھی بنا سکتا تھا - ایسی صورت میں انسان جبراً و قہراً خدا کے مقرر کردہ قوانین پر کاربند رہتا اور اس کی ضلالت و گمراہی کا کوئی امکان نہ ہوتا - لیکن ایسی دنیا جس میں جبر ہی جبر ہوتا اور اختیار مطلقاً معدوم ہوتا ایک میکانکی دنیا ہوتی جس میں تعمیر، ترقی اور جد و جہد کے لئے کوئی جگہ نہ ہوتی - یہی بات قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی دہرائی ہے :-

لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا ولو شاء الله لجعلكم امة واحدة ولكن ليبلوكم في ما آتاكم فاستبقوا الخيرات - (۶-۵۱)

تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک طریقہ اور راستہ ٹھہرایا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں تم کو آزمائے - اس لئے نیکی کے کاموں کی طرف سبقت کرو -

وان كان كبر عليك اعراضهم فان استطعت ان تبتغي نفقا في الارض او سلما في السماء فتأتيهم باية ولو شاء الله لجمعهم على الهدى فلا تكونن من الجاهلين (۶-۳۵)

اور اگر ان کا انکار تم پر گراں گزرے تو اگر تمہارے لئے یہ ممکن ہو تو زمین میں کسی سرنگ کی تلاش کرو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ تاکہ اس طرح تم ان کے لئے کوئی نشانی لا سکو، اور اگر اللہ چاہتا تو وہ تم سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا - اس لئے جاہلوں کی طرح نہ بنو -

دونوں آیات میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ خدا کی طاقت سے یہ بعید نہ تھا کہ وہ انسانی اختیار کو بالکل سلب کر لیتا اور جمادات کی طرح انہیں بھی گنے بندھے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور کرتا لیکن خدا نے یہ نہیں چاہا تاکہ وہ انسان کو آزمائے ظاہر ہے کہ ایک خالص جبری دنیا میں آزمائش کا کوئی موقع نہیں ہے - کیونکہ آزمائش کے لئے اختیار و آزادی کا وجود

ضروری ہے۔ اگر یہ اختیار جو انسانوں کو دیا گیا ہے حقیقی نہیں بلکہ ایک التباس ہے تو انسان کی آزمائش اور جزا و سزا بھی التباس محض قرار پائے گی۔ اور جنت و دوزخ کی حقیقت بھی ایک وہم و خیال سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ عالم کی تخلیق دو ہی صورتوں میں ممکن تھی۔ ایک یہ کہ تمام موجودات کو بالکل مقہور و مجبور بے بس اور بے اختیار رکھا جاتا اور تمام اشیا، حیوانات اور انسان ایک واحد اور فاعل و موثر ہستی کے اشاروں پر حرکت کرتے ان میں اپنے شعور ارادہ اور اختیار کا کوئی احساس نہ ہوتا۔ ان کے اندر انانیت اور خودی کا کوئی شائبہ نہ پایا جاتا اور ان کے تمام اعمال و افعال ایک پہلے سے بنے بنائے نقشہ کے مطابق وجود پذیر ہوتے۔ ایسی دنیا میں کسی فساد تخریب ہنگامہ اور باہمی مسابقت کا وجود نہ ہوتا۔ یہ بڑی پرسکون زندگی ہوتی جس میں کوئی کیفیت اور حالت نامعلوم اور غیر متعین نہ ہوتی بلکہ اشیا، حیوانات اور انسانوں کے خواص و صفات کے مشاہدہ سے اس امر کی پیش گوئی کرنا نہایت آسان ہوتا کہ ان کی زندگی کا اگلا قدم کہاں اور کس طرح اٹھے گا۔ ایک ریاضی دان جو عالم کے سوابق اور گذشتہ احوال سے واقف ہو اس کو موجودات کے آئندہ طرز عمل کا نقشہ مرتب کرلے میں کوئی دشواری نہ ہوتی۔ کیونکہ ایسی دنیا میں مستقبل محض ماضی کا اعادہ ہوتا۔ اس میں سکون و طمانیت تو ہوتی۔ ظلم و فساد اور تخریب کا کوئی وجود نہ ہوتا ہر ہستی ایک مقررہ ضابطہ کے مطابق اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتی اور باہمی تزاحم اور کشمکش کا کوئی نام و نشان نہ ہوتا۔ مگر ایسی دنیا ایک ساکن اور منجمد دنیا ہوتی جس میں ترقی۔ اقدام، اصلاح تعمیر اور تحسین و تزئین کی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ یہ ایک غیر ارتقاء پذیر عالم ہوتا جس میں انسان جذبہ خودی اور احترام ذات کے احساس سے خالی ہوتا۔ اس میں اثبات ذات کے لئے جدوجہد کرلے آگے بڑھنے، تصورات پیش کرنے اور ان پر عمل کرنے کی کوئی قابلیت نہ ہوتی۔ اس عالم میں انسانوں کے لئے ناممکن ہوتا کہ وہ کسی بہتر نصب العین کسی اجتماعی مقصد یا کسی بلند و برتر نظام اقدار کے لئے باہمی تعاون اور اتحاد کا کوئی منظر پیش کریں۔ ایسی دنیا میں نہ مذہب کی ضرورت ہوتی۔ نہ اخلاقیات کی۔ نہ قانون سازی کی اور نہ حکومت معاشرت اور تمدن کے اداروں کے لئے۔ کیونکہ یہ تمام مظاہر حصول اعلا حصول غایات کی جدوجہد سے رونما ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ اختیار انسانی کو بالکل معدوم کر دینے سے آدمی کی زندگی کل کیڑے مکوڑوں اور جمادات و نباتات کی مانند ہو جاتی۔ شر، ظلم، بدی اور تمام اقدار سیئہ کا مطلقاً سد باب ہو جاتا مگر ساتھ ہی خیر کے تمام امکانات بھی ختم ہو جاتے۔ ترقی۔ اقدام۔ تعمیر و تحسین نیکی اور حسن عمل غرضکہ سارے معیار عالیہ بالکل مفقود ہوتے۔ اس لئے قدرت الٰہی نے انسان کو ایک اختیاری ہستی بنا کر شر کا خطرہ مول لیا لیکن جیسا کہ انی اعلم ما لا تعلمون کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے خدا کو انسان پر اعتماد تھا کہ وہ بہ نسبت شر کے خیر کا زیادہ دلدادہ ہوگا اور عالم کائنات میں بحیثیت مجموعی خیر کا پلہ ہمیشہ بھاری رہے گا۔ یہ اس لئے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا تھا اور فطرت الٰہی خیر محض ہے بیدک الخیر انک علیٰ کل شیء قدیر (تیرے ہاتھ میں خیر ہے اور تو تمام چیزوں پر قادر ہے) انسان کے اختیار و آزادی سے خدا کی قدرت و توانائی میں کوئی کمی نہیں

آتی اور نہ اس کی قدرت پر کوئی تحدید عائد ہوتی ہے کیونکہ خدا نے اپنی آزاد مرضی سے انسان کو اپنا اختیار منتقل کیا اسے کوئی مجبوری لاحق نہ تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک بار اسے اختیار دے دینے کے بعد خدا کی عظمت سے بعید ہے کہ وہ بار بار اس کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان اپنی آزادی اور اختیار کو انہیں حدود و قوانین کے ماتحت استعمال کر سکتا ہے جو خدا نے پہلے سے اس کے لئے مقرر کر دیئے ہیں۔ اس لئے اس کی آزادی آزادی مطلق نہیں ہے اور نہ اس کا اختیار اختیار لامحدود ہے۔

یہاں پر اس حقیقت کا اعادہ بھی بے محل نہ ہوگا، اختیار انسانی کے باعث دنیا میں شر کا جو سلسلہ پیدا ہوا اس میں بھی خیر کا ایک پہلو ہے۔ کیونکہ کوئی شر شر مطلق نہیں۔ جس چیز کو ہم شر کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ ایک قسم کی مزاحم اور منفی قوت ہے اور اسی مزاحمت کو دفع کرنے میں انسان کی عملی قوتیں بروئے کار آتیں اور اس کی مخفی طاقتیں اور صلاحیتیں پردۂ خفا سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کوئی نفی اور تضاد ایسا نہیں جس سے اثبات نہ پیدا ہو اور کوئی رکاوٹ ایسی نہیں جس پر غالب آ کے ہیں انسانیت ترقی کے مزید قدم نہ آگے بڑھائے۔

ہر چہ وا نسے مقامات خودی است ۔۔۔ فضل حق داند اگر دشمن قوی است

ہیگل کا پورا نظریہ تاریخ اثبات و نفی کی کشمکش کا فلسفہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح انسانیت اپنے ایک تاریخی دور کے نقائص کو رفع کرنے میں اثبات و ایجاب کے نئے قدم بڑھاتی ہے اور ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کرتی ہے جو پرانی اور نئی صداقتوں کی جامع ہو۔ ہر ہستی اور ہر حقیقت اپنی ضد سے ٹکراتی ہے اور پھر اس ٹکراؤ سے ایک اعلیٰ تر حقیقت کا ظہور عمل میں آتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر شر ایک نقص اور ایک رکاوٹ ہے جس کے دور کرنے کے وسائل انسان کے اندر اور باہر موجود رہتے ہیں۔ غالب اسی حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے۔

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج در جاندار بود ۔۔۔ پیش ازاں کیں درد رسد آں را مہیا ساختند

یعنی ہر مرض کے وجود میں آنے سے پہلے قدرت نے اس کے علاج کا سامان مہیا کر دیا اور ہر شر کی پیدائش سے قبل خدا نے اس کو خیر میں تبدیل کرنے کے اسباب فراہم کر دئے۔ خود قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برائیاں نیکیوں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔

ومن یفعل ذالک یلق اثاما یضٰعف	اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ گناہ کی لپیٹ میں آجائے گا۔ قیامت
له العذاب یوم القیامة ویخلد فیه	کے روز اس کے عذاب میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور وہ اسی
مهانا۔ الا من تاب وآمن وعمل عملا صالحا	میں ہمیشہ ذلت کے ساتھ مبتلا رہے گا سوائے اس شخص کے جس نے
فاولئك یبدل الله سیئاتهم حسنات	توبہ کی اور نیک عمل کیا تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو بھی اللہ اچھائیوں
[illegible] (۲۵ - ۷۰)	میں تبدیل کر دے گا اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے